(۱)

سارا گاؤں مشکل سے سو گھروں پر مشتمل تھا۔ اس گاؤں کا نام روشن پور تھا۔ یہ راستے سے ہٹ کر واقع تھا اور کوئی ڈامر یا پکی سڑک کبھی یہاں تک نہ آئی تھی۔ اس طرف کے دیہات میں آمد و رفت کا سلسلہ تانگوں یا پیدل چل کر طے ہوتا تھا۔ گاؤں چھوٹی ٹیڑھی میڑھی پگڈنڈیاں تھیں جو کثرت سے ایک دوسری کو کاٹتی تھیں۔ اکثر اوقات ایسا ہوتا تھا کہ کئی اجنبی گاؤں میں پہنچ کر پریشانی اٹھاتے تھے۔ مگر یہ روز کی بات تھی اور گاؤں والوں کو ایسے مسافروں کے ساتھ خندہ پیشانی سے پیش آنے کی عادت سی پڑ گئی تھی۔ بعض اوقات ان لوگوں کو پہر دو پہر ستانے کے لئے مکان اپنا [illegible] تھا۔

پگڈنڈیوں پر سارا دن سورج چمکا کرتا۔ دھوپ کی ماری ہوئی وہ بڑی مسکین اور صاف ستھری لیٹی رہتیں، مگر ان کی کمینگی اس وقت ظاہر ہوتی جب کوئی سواری ان کے اوپر سے گزرتی۔ تب وہ پگڈنڈیاں گرد و غبار کا ایک طوفان اٹھاتیں جو فضا میں دیر تک منڈلاتا رہتا اور دور و نزدیک جو بھی انسان' حیوان یا شجر اس کی زد میں آتا، یکساں سب کی دل آزاری کا سبب بنتا۔ کسان مسافروں کو غلط راستے پر ڈال دینا اور گرد اڑا اڑا کر آس پاس کے جانداروں کو تنگ کرنا ان پگڈنڈیوں کے پاس اپنی بدحالی پر خاموش احتجاج کرنے کے دو موثر طریقے تھے۔ روشن پور جانے کے لیے آپ کو رانی کوٹ کے چھوٹے سے قصباتی سٹیشن پر اتر کر ایسے ہی راستوں پر مغرب کی سمت دور تک چلنا پڑتا تھا۔ رستے میں آپ کو کتے ملتے۔ یہ ایسے ہی معمولی 'آوارہ کتے تھے جو ہر گاؤں میں ہوتے ہیں اور گاؤں والوں کی رائے یا خواہش کے بغیر ہی اپنے اوپر سارے گاؤں کی حفاظت اور دیکھ بھال کا ذمہ لے لیتے ہیں۔ یہ کتے عموماً قریب سے گزرنے والے مسافر کو بیرونی حملہ آور اور گاؤں کی سلامتی کے لئے سخت خطرے کا باعث سمجھتے' اپنے خدشات کا اعلان اونچی آواز میں بھونک کر کرتے اور اس طرح مخالفت کا اظہار کرتے ہوئے گاؤں تک تعاقب جاری رکھتے جہاں وہ آپ کو اپنے جیسے ہی معمولی اور شکی المزاج کتوں کے حوالے کر کے بے فکری سے واپس لوٹتے۔ کمزور دل و دماغ رکھنے والے مسافر اکثر طیش میں آ کر رک جاتے' انہیں کوستے' پتھر اٹھا اٹھا کر مارتے پیچھے بھاگتے اور طرح طرح کی حرکتوں سے سخت ناراضگی کا اظہار کرتے، لیکن طبع سلیم کے مالک لوگ

کتوں کی نسبت اپنے وقار اور برتر حیثیت کو زیادہ اہمیت دیتے اور درگزر کر کے نکل جاتے۔ اس طرح چودہ کوس کی لمبی مسافت کے بعد گرد میں اٹے اور اکتائے ہوئے، تھک ہار کر آپ روشن پور پہنچتے۔ یہ گاؤں نہر کے کنارے آباد تھا۔ نہر کا پانی یہاں کی زمینوں کو سیراب کرتا تھا۔

علاقائی طور پر اس گاؤں کی حیثیت، کم از کم رائے عامہ کے لحاظ سے غیر مسلم تھی۔ ایک گروہ جس کا سربراہ گاؤں کا سب سے عمر رسیدہ کسان احمد دین تھا، مدعی تھا کہ گاؤں صوبہ دلی میں، اور دوسرا گروہ جو سکھ کسان ہرنام سنگھ کی سربراہی میں تھا، دعویٰ کرتا تھا کہ گاؤں صوبہ پنجاب میں واقع ہے۔ اس بات پر اکثر چوپال میں مناظرے ہوا کرتے تھے۔ بہرحال یہ امر مسلم تھا کہ گاؤں ہر دو صوبہ جات کی مشترکہ سرحد پر کسی جگہ واقع تھا۔ اس گاؤں کی تہذیب بھی اسی دوئی کا نمونہ تھی۔ جو سکھ قوم کے افراد یہاں آباد تھے وہ پنجاب کے سکھ کسانوں کی طرح پہنتے کھاتے اور پنجابی زبان میں گفتگو کرتے تھے۔ ہندو اور مسلمان طبقہ یو۔پی کے کسانوں کی معاشرت کا روادار تھا۔ اس کے باوجود گاؤں کے دونوں حصوں کے افراد بڑے امن اور صلح جوئی کے ساتھ اپنے اپنے طور پر اپنی اپنی زندگیاں بسر کر رہے تھے۔

روشن پور کی تاریخ مختصر اور رومانی تھی۔ اسے آباد ہوئے نصف صدی سے چند سال اوپر کا عرصہ ہوا تھا۔ اس لحاظ سے وہ اس علاقے کا سب سے کم عمر گاؤں تھا۔ یہاں ابھی اس نسل کے بھی کئی افراد بقیدِ حیات تھے جس نے پہلے پہل آ کر [illegible] دوسری اور تیسری نسل اس کی زمینوں کی کاشت کر رہی تھی۔ تاریخ کا سب سے مستند ذریعہ بہرحال بوڑھا کسان احمد دین تھا جو عین جوانی میں یہاں آ کر بسا تھا اور ان چند کنبوں میں سے تھا جنہوں نے غیر آباد زمین میں سے روشن پور کا گاؤں آباد کیا تھا۔ یہ تاریخی کہانی وہ اس طرح بیان کرتا تھا:

جب سن ستاون کا غدر مچا تو نواب روشن علی خان ضلع رہتک کے کلکٹر کے دفتر میں معمولی اہلکار تھے۔ (ظاہر ہے کہ اس وقت وہ نواب نہیں رہے ہوں گے۔) مڈل تک تعلیم یافتہ تھے اور اپنی شرافت کی وجہ سے دوست و احباب اور گلی کوچہ میں قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھے جاتے تھے۔ اس زمانے میں وہ اپنی والدہ اور نئی بیاہتا بیوی کے ساتھ شہر کے ایک پرانے محلے میں رہتے تھے۔ جس روز شہر میں بغاوت کی آگ بھڑکی اور ہندوستانی سپاہی انگریز افسروں کے خلاف ہتھیار لے کر اُٹھ کھڑے ہوئے، اس روز شہر کے عوام میں بھی خوف و ہراس کے ساتھ ساتھ غم و غصہ کی لہر دوڑ گئی۔ کئی جگہ لوگ گلی محلوں میں اکٹھے ہو کر چھاؤنی سے آنے والی خبروں پر کان لگائے بیٹھے تھے گویہ سمجھنا غلطی ہوگی کہ وہ سب کے سب انگریزوں کے جانی دشمن تھے۔ رات پڑی تو سب شہری اپنے اپنے مکانوں میں بند ہو کر بیٹھ گئے۔

شام کے قریب روشن علی خان نے اپنے ایک علیل دوست سے، جس کی مزاج پرسی کی خاطر وہ اس کے ہاں تشریف لے گئے تھے، اجازت حاصل کی اور گھر لوٹے۔ اپنی گلی سے پچھلی گلی کے اندر داخل ہوتے تھے کہ چند

قدم آگے ایک بھاگتے ہوئے شخص پر نظر پڑی۔ دیکھتے دیکھتے وہ سایہ لڑکھڑا کر گرا اور ساکن ہو گیا۔ انہیں تشویش ہوئی۔ تیزی سے بڑھ کر اس پر جھکے لیکن اندھیرے کی وجہ سے کچھ پہچان نہ پائے۔ پھر آوازیں دیں، ٹٹولا، ناک کے آگے ہاتھ رکھ کر سانس کی روانی کو محسوس کیا اور صرف اتنا جان پائے کہ کوئی مصیبت کا مارا غش کھا گیا ہے۔ بغیر سوچے سمجھے اٹھا کر کندھے پر لادا اور چل پڑے۔ مضبوط آدمی تھے، ایک گلی آسانی سے چل کر پار کر لی۔ پر بے ہوش آدمی وزن دار ہوتا ہے، ایک جگہ جو کندھا بدلنے کو رکے تو کوئی سخت سی شے محسوس ہوئی۔ ٹٹول کر دیکھا تو اس شخص کی کمر کے ساتھ بندھا ہوا طپنچہ تھا۔ ساتھ ہی ان کا ہاتھ خون سے لتھڑ گیا۔ وہ زخمی بھی تھا۔ ان کا ماتھا ٹھنکا لیکن اسے اٹھائے ہوئے چلتے رہے۔

گھر پہنچ کر جو چراغ کی روشنی میں دیکھا تو یکلخت سرد پڑ گئے۔ ان کے سامنے سنہری بالوں والا ایک انگریز پڑا تھا جو ہندوستانی دکانداروں کے لباس میں تھا۔ اس کا چہرہ بے حد زرد اور سانس مدھم تھا۔ انہوں نے دوڑ کر دروازہ بند کیا اور اسے ہوش میں لانے کی تدبیر کرنے لگے۔ سب سے پہلے گھر کی عورتوں کو پردے میں کر کے اس کا لباس تبدیل کیا اور ٹانگ کے زخم پر، جو تیز دھار آلے سے لگایا گیا تھا، پٹی باندھی۔ پھر محلے کی دائی اماں کو بلایا۔ پہلے تو اس نیک بی بی نے مریض کے فرنگی ہونے کی رو سے اس کے نزدیک آنے سے انکار کر دیا۔ مگر پھر روشن علی خان کے اور ان کی بیوی کے، جو اس خوبصورت جوان کو کسمپرسی کی حالت میں دیکھ کر کافی غمزدہ تھی، منت سماجت کرنے سے اس کی دیکھ بھال کرنے پر رضامند ہوئی۔ [illegible] بی بی کا مرحوم شوہر [illegible] روشن علی [illegible] حکیم تھا اور گو اس کی وفات سے خاندان میں یہ پیشہ ختم ہو چکا تھا، پر اس واسطے سے مرحوم کی بی بی کو جو مرحوم سے زیادہ طویل العمر ثابت ہوئیں، کسی حد تک طبابت میں دخل تھا۔ بہرحال اس سفید فام مریض کے سلسلے میں ان لوگوں سے جو کچھ ہو سکا انہوں نے کیا۔

یکایک گلی میں شور اٹھا اور چند لمحوں کے اندر شورِ قیامت معلوم ہونے لگا۔ پھر روشن علی خان کے گھر کا دروازہ دھڑا دھڑ کوٹا جانے لگا۔ گھر کے مالک نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا تو ہندوستانی سپاہیوں کی ننگی تلواریں اور برچھیوں کے پھل مشعلوں کی روشنی میں چمکتے نظر آئے۔ گلی میں ہر طرف ہاہاکار مچی تھی اور سر ہی سر نظر آتے تھے۔ تھوڑی دیر تک اندر سے کوئی جواب نہ ملا تو باغیوں نے دروازہ توڑنے کا فیصلہ کیا۔

اوّل اوّل تو محلے کے لوگ گھروں میں دبکے بیٹھے رہے کہ جانے کس کی موت آئی ہے۔ پھر جب بات کھل گئی کہ اس غیظ و غضب کا رخ محض روشن علی خان کے گھر کی جانب ہے تو چند سربراہ دبکے دبکائے نکلے اور کسی نہ کسی طور اس دروازے تک پہنچے جس کے توڑے جانے کی تجویزیں ہو رہی تھیں۔ وہاں پر انہیں جو بتایا گیا وہ یہ تھا: ''کرنل جانسن، چھاؤنی کے کمانڈنگ افسر، بھیس بدل کر گھیرے میں سے بچ نکلے ہیں اور دلی پہنچنا چاہتے ہیں۔ رستے میں چند سپاہیوں سے ان کی مٹھ بھیڑ بھی ہوئی لیکن وہ ان میں سے تین کو موت کی نیند سلا کر اور خود تلوار کا زخم کھا کر نکل آئے ہیں۔ اب ان کے خون کی لکیر اس دروازے میں داخل ہوتی ہے۔ انہیں ہمارے حوالے کیا

UrduPhoto.com

جائے ورنہ دروازہ توڑ کر گھر کے مکینوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے گا۔" محلے کے سربراہوں نے کہ خود خوفزدہ تھے ہر قسم کی مدد کرنے کا وعدہ کیا اور باغیوں کے غصے کو فی الوقت ٹھنڈا کر کے کسی نہ کسی راستے سے مکان میں داخل ہوئے۔ اب ہر ایک سربراہ اپنی اپنی پگڑی اتار کر روشن علی خان کے پیروں پر رکھ رہا ہے، منتیں کر رہا ہے، دھمکیاں اور گھرکیاں دے رہا ہے۔ پر ہمت کا دھنی روشن علی خان اپنے اٹل فیصلے پر قائم ہے کہ جان جاتی ہے تو چلی جائے پر زخمی مہمان کو دشمنوں کے حوالے نہ کروں گا۔

اس کے بعد کے واقعات کے سلسلے میں داستان گو کے بیان میں بڑی گڑبڑ تھی۔ کبھی وہ کہتا کہ جب دروازہ توڑا گیا تو بہادر نوجوان نے ایک کندھے پر زخمی مہمان کو دوسرے پر اپنی بیوی کو بٹھایا اور لڑتا بھڑتا ہوا صحیح سلامت نکال لے گیا۔ کچھ موقعوں پر اس نے یہ بھی بیان دیا تھا کہ چند مصلحتوں کی بنا پر باغی دروازہ توڑنے سے باز رہے مگر سارے علاقے کو گھیرے میں لے لیا اور رسد و رسائل کے تمام وسائل منقطع کر دیئے گئے۔ یہ سلسلہ کئی ہفتوں تک جاری رہا، یہاں تک کہ اہالیانِ شہر پر فاقوں کی نوبت آ گئی۔ پھر خدا کا کرنا ایسا ہوا کہ فرنگیوں کو فتح نصیب ہوئی اور محاصرین کو نجات ملی۔ ایک حکایت یہ بھی تھی کہ روشن علی خان نے جب کوئی راہ فرار نہ دیکھی تو گھر کے فرش میں سرنگ لگانی شروع کی جو چھاؤنی میں جا نکلی۔ اس راستے سے وہ کرنل جانسن اور اپنی بیوی کو نکال کر لے گیا اور بالآخر محلے کے سربراہوں کی رائے سے جب گھر کا دروازہ ایک دن توڑا گیا تو گھر میں صرف ایک بڑھی عورت کی لاش [illegible] تھی۔ قصہ مختصر یہ کہ سربراہوں اور باغیوں کو سخت پشیمانی کا سامنا کرنا پڑا۔ ان حکایات کی صحت کی طرف توجہ دینے کی کسی کو ضرورت یوں محسوس نہ ہوتی کہ اس کے بعد داستان گو کے خیالات کی لڑی پھر سمٹ جاتی اور وہ کمال یکسوئی سے یوں گویا ہوتا:

"جب غدر کا خاتمہ ہوا اور باغی کیفرِ کردار کو پہنچے تو کرنل جانسن نے، جو شاہِ انگلستان کے قریبی عزیزوں میں سے تھا، روشن علی خان کو دلی دربار میں بلا بھیجا اور اپنے دستِ خاص سے خلعت عطا کی اور کہا کہ جاؤ اور جا کر جتنی زمین جہاں سے چاہو گھیر لو، تمہیں عنایت کی جائے گی۔ اس کے بعد اس فیاض انگریز حاکم نے، جسے اردو زبان پر غیر معمولی قدرت حاصل تھی، ایک عجیب و غریب تقریب کے دوران (جس کا تفصیلی ذکر آگے چل کر آئے گا) نواب روشن علی خان کو آغا کا لقب عطا کیا۔"

زمین گھیرنے کے متعلق دو روایتیں تھیں۔ ایک کے مطابق نواب صاحب نے گھوڑے پر سوار ہو کر چکر لگایا اور گھوڑے کی پونچھ کے ساتھ ایک شہد بھرا ٹین باندھ دیا جس کے پیندے میں سوراخ تھا۔ شہد ٹپکتا رہا اور کیڑے مکوڑے آ کر اس پر جمع ہوتے گئے۔ اس طرح قدرتی حد بندی زمین کی ہو گئی۔ دوسری کے مطابق انہوں نے پیدل بھاگنا شروع کیا اور بانس کی کھپچیاں راستے میں گاڑتے گئے۔ غروب آفتاب کے وقت جب واپس پہنچے تو سانس اکھڑ گئی، پلٹ کر گرے اور مرتے مرتے بچے۔ اس سوال کے جواب میں بھی کہ رہائش کے لئے خاص طور پر اس علاقے کا انتخاب کیسے اور کیوں عمل میں آیا، کئی روایتیں مشہور تھیں جن کا بیان اس کتاب کے احاطے سے باہر ہے۔

اس ساری حکایت کے حرف بہ حرف صحیح ہونے کو یوں بھی عقل تسلیم نہیں مانتی۔ پھر بھی مناسب کاٹ چھانٹ کے بعد اسے حقیقت سے قریب تر لایا جا سکتا ہے۔ یہ تو بہر حال سب کے دیکھنے کی بات تھی کہ جب تک کرنل جانسن ہندوستان میں رہے ہمیشہ شکار کے لئے روشن پور آتے رہے اور جب روشن آغا یورپ گئے تو انہیں کے پاس ٹھہرے اور فیض پایا۔

اس طرح روشن پور کی جاگیر جو پانچ سو مربعوں پر محیط تھی قیام میں آگئی۔ واحد مالک روشن آغا تھے۔

روشن آغا اپنے معمولی پس منظر کے باوجود اس عظیم ذمہ داری کے پوری طرح اہل ثابت ہوئے جو اس بیش بہا خلعت اور جاگیر کی نوازش سے ان پر آ پڑی تھی۔ آخر عمر میں انہوں نے یورپ کا سفر کیا اور اپنے بیٹے کو تعلیم کے لئے ولایت بھیجا۔ گو واپس لوٹ کر اس نے ایک ایسی حرکت کی جس سے انہیں سخت صدمہ پہنچا، یعنی اس نے دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک ایسے گھرانے کی لڑکی سے شادی کر لی جس کے آبائی پیشے کو شرفاء میں قطعاً قدر کی نظروں سے نہیں دیکھا جاتا۔ اس کے بعد سے ان کا زیادہ وقت روشن محل میں رہا۔ روشن محل وہ عالیشان مکان تھا جو روشن آغا نے رہائش کی خاطر دارالسلطنت میں تعمیر کرایا تھا۔

گاؤں کے وسط میں بڑی سی پکی حویلی تھی جس میں روشن آغا کئی برس تک رہے تھے۔ اس کے گرد اگرد پچاس پچاس گز تک جگہ خالی پڑی تھی جہاں کسی وقت میں بڑا خوبصورت باغیچہ ہوگا، لیکن اب محض خشک پودے اور خود رو منڈ درخت [illegible] روشن آغا نے اپنے بیٹے کو معاف کر دیا تھا اور جا کر روشن محل میں رہنے لگے تھے، جس سے کہ ان کے فرزند نواب غلام محی الدین خان کو دلی سکون اور مسرت میسر ہوگئی تھی۔ اس حویلی کے علاوہ گاؤں کا دوسرا واحد پکا مکان گاؤں کے آخر پر واقع تھا۔ یہ مغلوں کا گھر تھا۔ مغلوں کے گھرانے کی کہانی اس طرح بیان کی جاتی تھی:

مرزا محمد بیگ اور نواب روشن علی خان کا گمنامی کے زمانے سے گہرا یارانہ چلا آتا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ ملازمت کے دوران دونوں ایک جگہ کام کرتے اور رہتے سہتے تھے۔ جب خداوند تعالیٰ نے اپنی بے نیازی میں روشن علی خان کو نیک نامی اور دنیوی جاہ و حشمت سے نوازا تو وہ اپنے دوست کو نہ بھولے اور ملازمت چھڑوا کر اسے اپنے ہمراہ لیتے آئے۔ محمد بیگ کا خالص مغلوں کا خاندان تھا اور قدرت نے اس گھرانے کو وہ خوبصورتی عطا کی تھی جو خالص نسلوں میں پائی جاتی ہے اور بدقسمتی سے روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ بلکہ بعض لوگوں کا کہنا تھا کہ روشن علی خان محمد بیگ کی بیوی کے بے مثال حسن و جمال کے حد سے زیادہ مداح تھے اور یہی عقیدت تھی جس نے انہیں مجبور کیا کہ وہ اپنی ملکیت میں سے پچاس مربعے زمین کے الگ کر کے اپنے عزیز دوست کو تحفتاً دے دیں اور اپنی جیب سے گاؤں میں پکا مکان بنوا کر دیں۔ افواہ تھی کہ محمد بیگ کا بڑا بیٹا نیاز بیگ بھی روشن علی خان کے واسطے سے تھا۔ لیکن افواہوں کا کیا ہے، کہنے والے تو یہاں تک کہتے تھے کہ خود نواب روشن علی خان کی اکلوتی اولاد اس فیاض اور عالی نسب انگریز کرنل کی بدولت تھی جو زخمی ہو کر چند دن ان کے ہاں مہمان رہا تھا اور جس کی وجہ سے روشن علی خان

UrduPhoto.com

پر جان کی مصیبت آئی تھی۔ حالانکہ اس غیر ملکی کی عالی نسبی اور شرافت کو نظر میں رکھا جائے تو عقلِ سلیم آسانی سے اس بات کو تسلیم نہیں کرتی۔ ہم یہ سوچ کر بھی ان افواہوں کی پرزور تائید کرنے سے باز رہنے پر مجبور ہیں کہ اس زمانے کے بزرگ قطعی طور پر مخلص، وضع دار اور شفیق ہوا کرتے تھے۔

جتنا عرصہ مرزا محمد بیگ زندہ رہے بڑی خوشحالی کی زندگی بسر کرتے رہے، اور دونوں کنبوں کی آپس میں محبت روز بروز ترقی کرتی گئی۔ محمد بیگ محنتی آدمی تھے اور صنعت و حرفت میں بہت دلچسپی رکھتے تھے۔ چنانچہ زمینداری کے ساتھ ساتھ انہوں نے گھر میں لوہے کے کام کی دکان کھول لی کہ ان وقتوں میں ایسے پیشے اختیار کرنے کو عار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ گو مرزا محمد بیگ کے لئے یہ کام پیشہ کم اور ہنرمندی کے شوق والی بات زیادہ تھی۔ اسی طرح سلوک اور محبت کے ساتھ وقت گزرتا جا رہا تھا کہ اچانک محمد بیگ کو عین جوانی کے عالم میں، جبکہ وہ ابھی پورے پینتیس برس کے بھی نہ ہوئے تھے، موت نے آدبوچا اور انہوں نے ایک بڑی پرسکون اور خوش نما زندگی گزارنے کے بعد جان جان آفریں کے سپرد کی۔ ان کی پراسرار بیماری اور موت کے متعلق بھی کئی افواہیں مشہور ہیں۔ لیکن چونکہ ان کا ہماری کہانی کے ساتھ کوئی براہِ راست تعلق نہیں ہم اس طرف زیادہ توجہ نہ دیں گے۔

مرزا محمد بیگ کی وفات کے بعد ان کے بیوی اور بچے نواب صاحب کی خاص شفقت اور نگرانی میں پرورش پاتے رہے۔ بڑا لڑکا نیاز بیگ پورے قد کا، بڑا گھبرو خوبصورت جوان نکلا اور باپ کے زمیندارے اور ہنرمندی کے شوق [illegible] باپ ہی کا کام [illegible] ماں نے اس کی شادی اپنے جیسے ایک خاص مغل گھرانے میں کی اور بڑی خوبصورت اور خوب سیرت بہو بیاہ کر لائی۔ شادی کے چودہ سال بعد خدا نے اسے بیٹا عطا کیا۔ لوگوں کا کہنا تھا کہ نیاز بیگ کی ماں نے پوتے کی پیدائش کا اتنی شدت اور اتنے شوق سے انتظار کیا تھا کہ اتنے لمبے عرصے کے بعد اس اچانک خوشی سے جو صدمہ پہنچا اس سے وہ جانبر نہ ہو سکی۔ ماں کے مرنے کے بعد نیاز بیگ نے ایک اور عورت کو گھر میں ڈال لیا۔ یہ دوسری عورت کسی نیچ ذات سے تھی۔

چھوٹا بیٹا ایاز بیگ پانچ سال تک سکول میں پڑھنے کی خاطر جاتا رہا کہ اسے پڑھائی کرنے کا شوق تھا۔ پھر اچانک اس کا اس کام سے جی اٹھ گیا اور وہ گھر سے بھاگ کر ریلوے کے محکمے میں ملازم ہو گیا۔ اس کے کئی سال بعد وہ گاؤں لوٹا۔

پھر ایک ایسا واقعہ ہوا جس کی وجہ سے اس گھرانے کے خوشگوار دن یکلخت غائب ہو گئے۔ نیاز بیگ کو حکومت کے خلاف کسی جرم کے الزام میں پکڑ لیا گیا اور چند روزہ عدالتی کارروائی کے بعد بارہ برس قید بامشقت کی سزا ہوئی۔ وہ چند دن جب مغلوں کے اس باعزت کنبے پر بدقسمتی وارد ہوئی تھی ابھی تک گاؤں والوں کے حافظے میں محفوظ تھے اور اس کا ذکر کرتے ہوئے اب بھی لوگ آواز نیچی کر لیتے تھے اور رنج سے سر ہلانے لگتے تھے۔ حکومت نے اسی پر اکتفا نہ کی بلکہ ان دونوں بھائیوں کی زیادہ تر زمین ضبط کر لی، اور تھوڑی سی جائداد جس پر نیاز بیگ کی دونوں بیویوں کا بمشکل گزارہ چل سکتا تھا، چھوڑ دی۔ اب اکیلی رہتی ہوئی وہ دونوں عورتیں بڑی عسرت اور

تنگی میں بڑھاپے کا انتظار کرنے لگیں۔ اس طرح گاؤں کے اس اکلوتے آزاد گھرانے پر قدرت کی طرف سے بدبختی اور ذلت نازل ہوئی۔

چھوٹے بھائی ایاز بیگ نے اس واقعے سے بددل ہو کر گاؤں چھوڑ دیا۔ لیکن جاتے ہوئے وہ نیاز بیگ کے لڑکے نعیم کو جو اپنے باپ کے جیل جانے کے وقت تین سال کا تھا اپنے ساتھ لیتا گیا۔ اسے اپنے بھتیجے سے بڑی محبت تھی۔ ایاز بیگ معمولی تعلیم و تربیت کے باوجود اس خداداد ذہانت اور صلاحیت کا مالک تھا جس کے بل پر بہت سے معمولی آدمیوں نے دنیا میں ناموری پائی ہے۔ اس کا اس نے پورا فائدہ اٹھایا اور عمارتی تعمیر کے کام میں کمال فن حاصل کیا۔ ہوتے ہوتے وہ کلکتے کی ایک مشہور تعمیری فرم میں انجینئر کے عہدے تک جا پہنچا۔ اس نے تمام عمر شادی نہ کی۔ تنہائی پسند اور ستھرے مذاق کا آدمی تھا۔ بہت روپیہ کمایا لیکن کبھی گاؤں نہ لوٹا۔ نعیم کو اس نے بہترین انگریزی سکولوں میں تعلیم دلائی اور ساری امیدیں اس کے ساتھ وابستہ کر دیں۔

روشن پور کا ہماری کہانی کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ لیکن ابتدائی چند یوم آپ کو دارالسلطنت دلی میں بسر کرنے ہوں گے کہ اس زمانے میں جس زمانے سے ہم نے کہانی کی ابتدا کرنے کا فیصلہ کیا ہے سارے اہم افراد وہاں پر جمع تھے۔

اور یہ وہ زمانہ تھا جب نواب روشن علی خان آف روشن پور اسی برس کی عمر پا کر حال ہی میں فوت ہوئے تھے اور ہندوستان کی آزادی کی جنگ ابتدائی مرحلوں میں تھی۔

UrduPhoto.com

## (۲)

کوئنز روڈ کے آخر میں روشن محل تھا۔ یہ ایک قدیم وضع کی وسیع دو منزلہ کوٹھی تھی۔ آگے کرزن روڈ شروع ہوتی تھی۔

ان کو دور ہی سے آج کے دن کی چہل پہل دکھائی دے گئی۔ پھاٹک پر کاغذی جھنڈیاں اور رنگ برنگ بجلی کے قمقمے لٹک رہے تھے۔ بگھی سے اترے تو انہوں نے دیکھا کہ لمبی ڈرائیو پر جو سامنے والے برآمدے تک جاتی تھی تازہ سرخ بجری بچھائی گئی تھی اور دونوں اطراف چونے کی متوازی لکیریں لگی تھیں۔ برآمدے میں دو میزیں پڑی تھیں۔ ایک پر میز پوش تہہ کیے رکھے تھے دوسری کے گرد بہت سارے لڑکے لڑکیاں کھڑے نیپکن بنا رہے تھے۔ برآمدے کے سامنے وسیع لان میں میزیں اور کرسیاں لگائی جا رہی تھیں۔ دن کی روشنی ابھی باقی تھی مگر برآمدے اور باغ میں قمقمے جل رہے تھے۔ صرف برآمدے میں شور تھا جہاں میز کے گرد خوش پوش اور تندرست لڑکے لڑکیاں جمع کام کر رہے تھے۔ سبزے پر نوکر سفید وردیاں پہنے خاموشی سے ایک دوسرے کو ہدایات دے رہے تھے۔

ایاز بیگ اور نعیم جب برآمدے میں چڑھے تو سامنے سے بھوری آنکھوں والی ایک نوعمر لڑکی جو چارخانہ

انداز میں نکلی۔

''چچا.....'' وہ ٹھٹک کر اونچی آواز میں بولی ''تسلیم۔ بابا بیٹھے ہیں۔ آپ چلیے اندر' ہم لوگ ٹیکپن بنا رہے ہیں۔ ابھی تو.....'' وہ گھڑی دیکھتی ہوئی جا کر نو عمروں کے اس گروہ میں شامل ہو گئی۔

نعیم ان کی طرف متوجہ تھا۔ ان کی اوسط عمر نعیم کی عمر کے لگ بھگ تھی۔

''دیکھو عذرا' پرویز اُلٹی طرف سے بنا رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہی سیدھا ہے۔'' پہلی لڑکی سے ایک دوسری لڑکی جو سرخ ریشمی لباس میں تھی' بولی۔

بھوری آنکھوں والی لڑکی نے جا کر اسی جارحانہ انداز میں سب سے لمبے اور بڑی عمر کے لڑکے کا ٹیکپن کھول دیا۔ ''غلط۔ بالکل غلط'' وہ بولی۔ اس کے بھورے رنگ کے لمبے بال ہوا میں اڑ رہے تھے اور گردن کی سفید جلد دکھائی دے رہی تھی۔ ''دیکھو بھئی سب لوگو'' اس نے چلا کر کہا ''پرویز یوں بناتا ہے۔'' اور رومال کو بے ترتیبی سے گول مول لپیٹ دیا جسے دیکھ کر سب ہنسنے لگے۔

''یہاں تو مولانا [illegible] پر باندھ کے نماز پڑھاتے ہیں۔'' ایک موٹا سا سفید رنگت والا لڑکا بولا۔ قہقہوں کا شور بلند ہوا۔ بھوری آنکھوں والی لڑکی سر پیچھے پھینک کر ہنس رہی تھی جس سے گردن کی پشت پر [illegible] صحت مند جلد اکٹھی ہو کر ابھر آئی تھی اور گلے پر تنگ فراک گوشت میں دھنسا جا رہا تھا۔ اس کا گہرا سرخ چہرہ ایک بالکل ہنسی میں تنا ہوا تھا۔ زہرہ کیا [illegible]

پرویز [illegible] سب کا منہ دیکھتا رہا' پھر بہت گھبرا کر جھینپ گیا۔ ''میں کوئی لڑکی تھوڑا ہوں۔ یہ تو لڑکیوں کا کام ہے یا بیروں کا۔'' وہ ہنسی تیز ہو گئی۔

اپنے آپ کو اجنبی فضا میں پا کر نعیم کا دل زور زور سے دھڑکنے لگا تھا۔ لیکن کھل کر ہنستے ہوئے لوگوں کو دیکھ کر بے تکلفی' سادگی اور برابری کا جو احساس ہوتا ہے اس کی وجہ سے اس کا جی چاہا کہ وہ بھی جا کر ان میں شامل ہو جائے۔ اسی وقت وہ ایاز بیگ کے پیچھے پیچھے اندر داخل ہو گیا۔

کمرۂ نشست میں داخل ہو کر جس پر سب سے پہلے نعیم کی نظر پڑی وہ گھر کا مالک تھا۔ نواب غلام محی الدین ایک کونے میں بڑی سی میز پر بیٹھے کچھ لکھ رہے تھے۔

''آئیے آئیے۔'' وہ بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر بولے۔ ''میں اتنی جلد آپ کا متوقع نہیں تھا۔ کب آئے؟''

''آج صبح'' ایاز بیگ نے بہت جھک کر مصافحہ کیا۔ اپنے چچا کو اتنی انکساری کے ساتھ کسی سے ملتے ہوئے نعیم نے پہلے نہیں دیکھا تھا۔ نواب صاحب کے چہرے پر سب سے نمایاں شے ان کی ناک تھی جو اونچی اور نوک دار تھی اور انہیں مردانہ شکل وصورت عطا کرتی تھی۔

''افسوس ہے روشن آغا کی وفات پر حاضر نہ ہو سکا۔ ملازمت کا سلسلہ ہے۔'' ایاز بیگ نے کہا۔

''آپ تو بڑے فرض شناس افسر ہیں۔ ٹھیک ہے کام وام کرتا ہی آدمی اچھا لگتا ہے۔ ہماری بھی کوئی

...ری ہے۔" انہوں نے اسی شرارت بھری معصوم مسکراہٹ کے ساتھ کہا جو پرانے خاندانی لوگوں کا حصہ ہوتی ہے۔

"بجا فرمایا۔ بجا فرمایا۔" ایاز بیگ ہاتھ ملتے ہوئے خوش دلی سے بولے۔ دونوں دوستوں کی آنکھوں میں ...ک تھی۔ پھر وہ نعیم کی طرف متوجہ ہوئے۔ "یہ صاحب زادے......؟"

نعیم نے ایاز بیگ کی تقلید میں بہت جھک کر مصافحہ کیا جس سے اس کی ٹوپی کا پھندنا نواب صاحب کے ...تھ کی پشت سے جا لگا۔

"بھتیجا ہے۔"

"اوہ۔ میں سمجھا۔" وہ غور سے اسے دیکھتے ہوئے بولے۔ آہستہ آہستہ ان کے چہرے پر سنجیدگی کی تختی ...ید ہونے لگی۔ تینوں آدمیوں کے درمیان عجیب سی خاموشی چھا گئی۔ ایاز بیگ کا چہرہ بے حد اداس ہو گیا۔ نواب صاحب کے ماتھے کو دو حصوں میں تقسیم کرتی ہوئی رگ ابھر آئی۔ باریک ریشمی گاؤن پہنے وہ اپنے مضبوط چہرے اور وحشیانہ قوت سے بھرپور جسم لیے سیدھے بیٹھے رہے پھر اچانک انہوں نے پہلو بدلا اور آہستہ آہستہ کہنے لگے۔

"میں دیکھ رہا تھا اس کی شکل نیاز بیگ سے بہت ملتی ہے۔ خوبصورت آدمی تھا۔ واپس آ گیا ہے؟"

"جی ہاں۔"

"کے سال بعد؟"

"بارہ۔"

UrduPhoto.com

"اوہ..." وہ اٹھ کر کمرے میں ٹہلنے لگے۔ "پڑھتا ہے؟"

"کلکتے میں۔ اس سال سینئر کیمبرج کیا ہے۔" ایاز بیگ نے بتایا۔

"ہوں۔ آپ نیاز بیگ سے ملے؟"

"نہیں۔"

"ملیں گے؟"

"نہیں۔"

دونوں کچھ دیر تک خاموش رہے' پھر ایاز بیگ نے موضوع تبدیل کرتے ہوئے کہا "آج تو کافی رونق ہوگی۔"

"امید تو ہے۔" نواب صاحب کی سنجیدگی دور ہو گئی۔ "چیف کمشنر آئیں گے۔ کلکٹر بھی شہر میں ہیں' شاید آ جائیں اور آپ کی اپنی بیسنٹ بھی آ رہی ہیں' ذرا تیار رہیے گا۔ آپ بھی بڑے زوردار تھیوسوفسٹ ہیں۔" پھر انہوں نے ایاز بیگ کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر غور سے دیکھا۔

"بوڑھے ہو گئے ہو۔"

"وقت سب کو بوڑھا کر دیتا ہے۔" ایاز بیگ نے مسکرا کر کہا۔ نعیم بہت بے چین بیٹھا تھا۔ اپنے باپ کا

ذکر اس نے بہت کم سنا تھا اور یہ منظر جو آج اس نے دیکھا اور محسوس کیا بالکل نیا تھا۔ موضوع کی تبدیلی سے اسے کافی تسکین ہوئی اور وہ غور سے اپنے میزبان کو دیکھنے لگا۔

نواب صاحب چالیس کے لگ بھگ اور بہت صحت مند تھے۔ چشم ان کی ناک میں گہرا پھنسا ہوا اور گال شیشے سے اوپر ابھرے ہوئے تھے۔ آنکھیں گہری اور جبڑے اور ٹھوڑی اور سر کی ہڈی مضبوط اور چوڑی تھی۔ ان کے ہاتھ نازک اور خوش نما تھے۔ معمولی ناک نقشے کے باوجود ان کے چہرے پر وہ نرمی اور خوش شکلی تھی جو پُر آسائش زندگی کا پتہ دیتی ہے۔ گفتگو کرتے ہوئے وہ ایک ہاتھ کو بڑے دل کش انداز میں حرکت دیتے تھے۔

کمرہ بڑے قرینے سے سجا تھا۔ نعیم کے عین پیچھے ایک بھس بھرا شیر کھڑا تھا جو خطرناک حد تک زندہ دکھائی دے رہا تھا۔ چاروں کونوں میں اونچے اونچے فرشی لیمپ روشن تھے۔ کھڑکیوں پر بھاری پردے اور فرش پر دبیز بے آواز قالین پڑے تھے۔ برآمدے کے شور کے مقابلے میں اندر گہری خاموشی اور سکون تھا۔ غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا تھا کہ دروازوں کھڑکیوں کی درزیں قالین کی تہوں سے بند کی گئی تھیں۔

پھر ان کا میزبان اٹھا اور تھوڑی دیر تک لان پر ملنے کا وعدہ کر کے اندر کے کمروں کی طرف چلا گیا۔

باہر آ کر نعیم نے دیکھا کہ نیپکن ساری میزوں پر رکھے تھے اور سفید وردیوں والے بیرے آخری انتظامات میں مصروف تھے۔ [illegible] تھا۔ [illegible] کے بغل والے [illegible] لان میں بیٹھنے کا انتظام کیا گیا تھا۔ ایاز بیگ سے کونے میں ایک لڑکی [illegible] بیٹھی اور [illegible] چہرہ [illegible]

نعیم ادھر ادھر پھرنے لگا۔ اس وقت اندر سے وہی لڑکے لڑکیاں باتیں کرتے نکلے اور ادھر ادھر پھیل گئے۔

لمبے لڑکے نے تعظیم سے جھک کر ایاز بیگ کو سلام کیا۔ پھر وہ نعیم کی طرف آیا۔

”آپ کلکتے سے آئے ہیں؟“

”جی ہاں۔“

”میں پرویز ہوں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔ ”یہ...... ہمارا گھر ہے۔“ نعیم نے ہاتھ ملایا اور خاموشی سے اسے دیکھنے لگا۔ ایک تنہا اور بے خطر پرورش کے طفیل یہ اس کا قدرتی، بے زبان انداز گفتگو بن چکا تھا۔

”آئیے ادھر چلیں۔“ پرویز نے کہا۔

ان کو اپنی طرف آتے دیکھ کر وہ سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ اب انہوں نے کھلنڈروں والا لباس اتار کر تقریبی لباس پہن لیا تھا اور زیادہ ذمہ دار دکھائی دے رہے تھے۔

”یہ...... کلکتے سے آئے ہیں۔“ پرویز نے پھیلا کر کہا۔ ”اور یہ میری بہن عذرا ہے۔ یہ سب ہمارے بہن بھائی ہیں۔“

نعیم گھبراہٹ میں اپنی لمبی سرخ ٹوپی اور پھندنے پر ہاتھ پھیرتا رہا۔

”آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی۔ بیٹھیے۔“ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ گئے۔

UrduPhoto.com

"آپ بولتے بالکل نہیں ہیں؟" عذرا نے اپنی بھوری آنکھیں نچا کر اسی بے تکلفی سے پوچھا۔

"جی جی نہیں تو۔" سب لوگ سادگی سے مسکرائے۔

"آپ نے نام نہیں بتایا اپنا۔"

"نعیم۔"

"اوہ...... کس قدر خوبصورت نام ہے۔" ایک پتلے سے لڑکے نے انگریزی میں کہا۔

کہ کھنے رہیں اور شور وشغب سب ختم ہو چکا تھا۔ گو ان کی آنکھوں میں تمسخر کی جھلک صاف دیکھی جا سکتی تھی۔

صرف عذرا اسی جارحانہ انداز میں باتیں کر رہی تھی۔ اب اس نے سفید ریشم کی ساڑھی باندھ رکھی تھی اور دیکھنے میں کافی بڑی اور سمجھدار لگ رہی تھی۔

"آپ کو پنگ پانگ کھیلنا آتا ہے؟"

"نہیں۔"

"دراصل آج ہمیں پتہ چلا کہ ہم میں سے آدھے لوگوں کو نہیں آتا۔"

"عذرا یہ تو غلط بات ہے۔" پتلا لڑکا انگریزی میں بولا۔ "اب تم کہو گی کہ تمہیں ساڑھی باندھنا نہیں آتا تو یہ بھلا کیا بات [illegible]"

UrduPhoto.com

کچھ دیر تک وہ اسی طرح باتیں کرتے رہے۔ پھر مہمان آنا شروع ہو گئے۔ ایاز بیگ نے نعیم کو پکارا اور وہ جا کر کیمرے میں فلم چڑھانے میں ان کی مدد کرنے لگا۔ آدھ گھنٹے کے بعد کیمرہ درست ہوا۔ اب کافی مہمان آ چکے تھے۔ نواب صاحب اور ادھیڑ عمر کی ایک خوبصورت عورت دروازے میں کھڑے ان کا استقبال کر رہے تھے۔ عذرا بھی پاس کھڑی تھی۔ پرویز اور گروہ کے دوسرے افراد مہمانوں کے درمیان ادھر اُدھر پھر رہے تھے۔ ابھی تک جو لوگ آ چکے تھے ان میں زیادہ تر غیر ملکی تھے۔ چند ایک نے اونچے سیاہ ہیٹ اور ٹیل کوٹ پہن رکھے تھے۔ باقی نے جو زیادہ تر نوجوان طبقہ تھا' شام کا سیاہ چست لباس پہن رکھا تھا اور سر سے ننگے تھے۔ تقریباً سبھی خاموش بیٹھے سگریٹ اور موٹے موٹے سگار پی رہے تھے۔ عورتوں نے بند گلے کے چست فراک پہن رکھے تھے۔ اب ہندوستانی مہمان آ رہے تھے۔ وہ مختلف قسم کے لباس میں تھے۔ مسلمان پھندنے والی سرخ ٹوپیوں اور لمبے چغوں میں تھے۔ کچھ لوگ شیروانیوں میں بھی تھے جن سے ان کے قوم و مذہب کا پتہ چلانا دشوار تھا کہ ہندوستان میں اب ہندو مسلم عیسائی سب نے شیروانیاں پہننی شروع کر دی تھیں۔ البتہ ہندو اپنی ڈھیلی اڑنگ دھوتیوں اور بڑی بڑی سفید پگڑیوں سے پہچانے جا سکتے تھے۔

وہ دو دو اور چار چار گھوڑوں والی بگھیوں میں آ رہے تھے۔ صرف انگریز مہمان اور چند ہندوستانی موٹروں پر آئے تھے۔ وہ پھاٹک پر نواب صاحب اور ان کی ساتھی عورت کے ساتھ اخلاق سے جھک کر ہاتھ ملاتے یا دو

سے ہاتھ جوڑ کر پرنام کرتے اور جا کر خاموشی سے بیٹھ جاتے۔ انگریز سب ایک طرف بیٹھے تھے' ہندوستانی دوسری طرف۔ غیر ملکیوں نے اپنی اپنی ٹوپیاں اور سکارف آتے ہی خادموں کے حوالے کر دیے تھے۔ ہندوستانی ٹوپیاں پہنے' چھڑیاں ہاتھوں میں تھامے بیٹھے تھے۔

ایک ہندوستانی زرق برق شیروانی اور پگڑی پہنے موٹر سے اترا۔ ساتھ ایک نوجوان انگریزی لباس میں تھا۔ نواب صاحب بہت نیچے جھک کر ملے۔ کسی نے کہا مہاراج کمار پرتاپ گڑھ ہیں: ہمراہ غالباً سیکرٹری تھے۔ وہ واحد ہندوستانی تھے جو آ کر انگریزوں میں بیٹھے۔ انہوں نے اپنی چھڑی بھی خادم کے حوالے کر دی۔

پھر گوکھلے آئے جس پر تمام ہندوستانی اور چند انگریز اٹھ کھڑے ہوئے اور جھک جھک کر ملے۔ ایاز بیگ نے جب ان کا نام لیا تو نعیم چونک کر اٹھا اور قریب جا کھڑا ہوا۔ گوکھلے کا نام اس نے بہت سن رکھا تھا مگر دیکھنے کا آج پہلی بار موقع ملا تھا۔ انہوں نے پتلون کے اوپر بند گلے کا بڑے بڑے کالروں والا ہاف کوٹ پہن رکھا تھا اور سر پر ٹوپی لئے ہوئے تھے (اس قسم کی ٹوپی نعیم نے دکن میں بعض لوگوں کو پہنے دیکھا تھا)' گلے میں لمبا سا مفلر تھا۔ سنہرے فریم کا چشمہ لگائے اکہرے جسم کا یہ آدمی خوبصورت کہلایا جا سکتا تھا' گو بہت کمزور تھا۔ نعیم نے اس کے ساتھ ہاتھ ملاتے وقت عجیب سی کیفیت محسوس کی۔

پھر ڈاکٹر اینی بیسنٹ آئیں جن کا نام نعیم نے ایاز بیگ کی زبانی اکثر سنا تھا۔ وہ ہندوستانیوں کے ایک گروپ میں جا [illegible]

انار کے ایک پودے کے نیچے نعیم کھڑا تھا۔ پتوں میں چھپے ہوئے بلب کی روشنی اس کے چہرے پر پڑ رہی تھی۔

"ہیلو..... آپ نے پھلوں کا رس پیا؟" عذرا اس کے پیچھے سے نکل کر بولی۔

"نہیں۔"

"لیجئے۔" اس نے گلاس نعیم کے ہاتھ میں تھما دیا جو اس نے فوراً ہونٹوں سے لگا لیا۔

"سب مہمان آ گئے؟" بہت سوچ کر اس نے بات کی۔

"تقریباً۔" عذرا نے تمسخر اور سادگی کے عجیب انداز میں اس کی طرف دیکھا۔ نعیم نے محسوس کیا کہ سائے میں اس کی آنکھوں کا رنگ گہرا سیاہ ہو گیا تھا۔ اس نے گلاس میں سے دو بڑے بڑے گھونٹ لئے۔

"آپ ٹوپی بالکل نہیں اتارتے؟"

وہ گھبرا کر ٹوپی اور پھندنے پر ہاتھ پھیرنے لگا۔

"اتار دیجئے۔"

اس نے جلدی سے ٹوپی اتار دی۔

"یہ..... بٹن کھول دیجئے۔" عذرا نے انگلی سے اس کے گلے کی طرف اشارہ کیا۔ جب وہ اوپر کے دو چار بٹن کھول چکا تو دفعتاً وہ بہت گہری جھینپ گئی' "میرا مطلب ہے صرف یہ کہ..... آپ کو گرمی محسوس نہیں ہوتی شیروانی میں؟"

"نہیں۔"

"یوں ہی...... دیکھیے یہ ہمارے مٹر پھول سوکھ گئے ہیں۔ آخر اپریل تک ان کی بہار ہوتی ہے۔" اس کا چہرہ ابھی تک سرخ ہو رہا تھا۔ نعیم کو پہلی دفعہ محسوس ہوا کہ وہ کوئی غیر معمولی شے نہیں بلکہ عام سی لڑکی تھی، بالکل جس طرح کا وہ خود تھا۔ جلد ہی اس کے سحر میں سے نکل آیا۔ عذرا نے ہاتھ بڑھا کر ہولی ہوکس کا ایک گلابی پھول توڑا۔

"آج کل ان کی بہار ہے۔ مجھے اندر جانا ہے، آپ بیٹھیے۔" اس نے کہا۔ اندھیرے کی طرف جاتی ہوئی وہ ایک بڑی عمر کی سنجیدہ عورت کی طرح چل رہی تھی۔ نعیم نے اسے برآمدے میں غائب ہوتے دیکھا اور ہاتھ بڑھا کر چند خشک مٹر پھول توڑے۔ وہ کھڑکھڑا کر ٹوٹے اور بکھر گئے۔

مہمانوں کی ٹولیوں میں گفتگو بڑے زور شور سے شروع ہو چکی تھی۔ سامنے تین انگریز بیٹھے چوتھے کی باتیں غور سے سن رہے تھے۔ یہ چوتھا، جس کا سیاہ ہیٹ پیچھے گھاس پر پڑا تھا، ادھیڑ عمر کا بڑے سر والا شخص تھا اور بڑی محویت سے ڈرامائی انداز میں ہاتھ ہلا ہلا کر کوئی قصہ بیان کر رہا تھا۔ نعیم آگے بڑھا۔ ایک لمبے صوفے پر مہاراجکمار پرتاپ گڑھ چیف کمشنر کے ساتھ بیٹھے تاش کے پتے بانٹ رہے تھے۔

"تاش کے لئے یہ موزوں وقت تو نہیں مسٹر...... پر میں آپ کو سکھانے کے لئے بہت بے تاب ہوں۔ ایسا عجیب و غریب کھیل ہے جو یہاں پر کسی کو نہ آتا ہوگا۔ گزشتہ سال میں نے پیرس میں ایک خاتون سے سیکھا تھا۔" انھوں نے پتوں [illegible] ابتدائی اصول سمجھانے لگے۔ ساتھ بیٹھی ایک انگریز خاتون بھی دلچسپی لینے لگی۔ سیکرٹری ماہر فن کی طرح تاش لگا رہا تھا۔

جب نعیم ہولی ہوکس کی اس قطار کے ساتھ ساتھ، جس میں موسم گرما کے پھول کی پنیری لگی تھی، مہاراج کمار کے صوفے کے پیچھے سے گزرا تو وہ پتے ترتیب وار لگاتے ہوئے اچانک رک کر بولے:

"پیرس میں میں نے دیکھا مسٹر...... کہ جس ہوٹل میں میں ٹھہرا وہاں عجیب رواج تھا۔ وہ پیرس کا سب سے بڑا ہوٹل تھا اور ہر ایک "سوئٹ" کے ساتھ دو دو غسل خانے تھے۔ کیا ہوا کہ صبح صبح جب میں نہانے کے لئے نکلا تو کیا دیکھتا ہوں کہ سامنے والے "سوئٹ" سے ایک صاحب ننگ دھڑنگ، کمر کو تولیے سے پونچھتے نکلے چلے آ رہے ہیں۔ میں نے گھبرا کر کہا "او، معاف کیجئے" اور واپس چلا آیا۔ وہ صاحب جواب دیے بغیر نکل گئے۔

انگریز خاتون سرخ ہو گئیں۔ "انگریزی بہت کم سمجھتے ہیں وہاں پر۔" وہ جلدی سے بولیں۔

"جی ہاں۔" مہاراج کمار نے بے حد اخلاق سے کہا۔ "بڑی دقت ہوتی ہے۔ حیرت کی بات ہے کہ فرانس کا ساحل آپ سے صرف تیس میل دور ہے۔"

"درست ہے...... بالکل درست ہے......" خاتون نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔ "حیرت کی بات تو ہے۔"

"اچھا تو مسٹر......" مہاراج کمار نے بہرحال بات جاری رکھی۔ "دوسرے دن پھر یہی حرکت ہوئی۔ اب کے کوئی دوسرے صاحب تھے۔ میں بھی ڈھٹائی سے سامنے دیکھتا ہوا پاس سے گزر گیا۔ لیکن آگے نکلنے پر میں ایک

نظر پیچھے مڑ کر دیکھنے سے باز نہ رہ سکا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک خاتون بڑی بے خبری اور لاتعلقی سے میرے پیچھے پیچھے چلی آ رہی ہیں۔ اس کے بعد میں پیرس کا عادی ہو گیا۔

چیف کمشنر ہولے سے مسکرائے۔ سیکرٹری کے پاس جو نوجوان انگریز بیٹھا تھا' آگے جھک کر بولا ''بھئی پیرس کی عورتیں ہندوستانی عورتوں کی طرح تھوڑا ہوتی ہیں۔''

''ہاں جی'' مہاراج کمار نے سوچتے ہوئے کہا۔ ''بڑی مختلف عورتیں ہوتی ہیں۔''

اس پر زبردست قہقہہ پڑا۔ سب جی کھول کر ہنسے۔ چیف کمشنر مسکرائے اور اپنے بے حد وسیع ماتھے پر ہاتھ پھیرا۔ مہاراج کمار پھر سے پتے تقسیم کرنے لگے۔ صرف وہی ایک شخص تھے جو انگریزوں کے ساتھ بے تکلفی سے باتیں کر رہے تھے۔

آگے دو بڑی بڑی پگڑیوں اور دھوتیوں والے ہندو تاجر بیٹھے تجارت کی باتیں کر رہے تھے۔ مجمع کے اوپر سے نعیم نے دوسری طرف دیکھا۔ تین [illegible] انگریز [illegible] کر ان کرسیوں کے آگے اس طرح پھر رہا تھا جیسے جنگلی جانور پنجرے میں چکر لگاتا ہے' اور اسی انہماک سے بول رہا تھا۔ پھاٹک کے اندر جو کاریں کھڑی تھیں ان کا نظارہ [illegible] کے لیے چند بچے اور نچلے طبقے کے لوگ سڑک پر جمع ہو گئے تھے۔ چیف کمشنر کے ہمراہ آئے ہوئے سپاہی انھیں بید مار مار کر بھگا رہے تھے۔ لیکن وہ ایک جگہ سے ہٹ کر دوسری جگہ جا کھڑے ہوتے۔ مئی کے شفاف آسمان [illegible] گرم [illegible] روشن تھے۔ اگلے صوفے پر اسے ایاز بیگ دکھائی دیے جو ڈاکٹر اینی بیسنٹ کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ ان کی گفتگو میں ایک اور شخص بہت صاف رنگت اور سیاہ بالوں والا' بھی شامل تھا۔ نعیم اپنے چچا کے پاس خالی جگہ پر بیٹھ گیا۔

''لیکن مسٹر بیگ' اس بات پر میں میڈم بلیوٹسکی سے متفق نہیں ہوں۔'' اینی بیسنٹ کہہ رہی تھیں۔ ''وہ کہتی ہیں کہ ستاروں کی دنیا میں جو وجود ہیں وہ محض روحیں ہیں اور یہ کہ وہ مادی نہیں ہیں' اور وہ انہیں مابعدالطبیعیاتی طور پر ثابت کرنا چاہتی ہیں۔ میں کہتی ہوں کہ وہ باقاعدہ طور پر اجسام ہیں اور مادی ہیں اور طبیعیاتی طور پر اس کا ثبوت پیش کیا جا سکتا ہے اور یہ کہ طبعیات کے اطلاق سے ''تھیوسوفی'' کی تھیوری پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔''

''لیکن اس بات کا جواب پچھلی اپریل میں میں نے آپ کو خط میں بھی دیا تھا کہ ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ تھیوسوفی پر سائنس کو صادر کیا جا سکے۔'' ایاز بیگ بولے۔

''سائنس کے قانون کو 'صادر' کرنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔'' اینی بیسنٹ نے اپنے دل کش لہجے میں کہنا شروع کیا ''صادر کرنا اور بات ہے اور......''

نعیم نے اکتا کر سننا چھوڑ دیا۔ اس کی سمجھ میں اس گفتگو کا ایک لفظ نہ آیا تھا' لیکن وہ مسز بیسنٹ پر سے نظریں نہ ہٹا سکا۔ اس کے سر پر برف ایسے سفید بالوں کی ٹوپی سی بنی ہوئی تھی اور اس کی آواز' نعیم نے سوچا' شاید دنیا کی خوبصورت ترین آواز تھی۔ اپنی عمر کے باوجود وہ بڑی پرکشش عورت تھی۔

دل میں وہ سوچ رہا تھا۔ عذرا کے جانے کے بعد کسی نے اس سے بات نہ کی تھی۔ اس لڑکی کے ساتھ مختصر ملاقات اور اس کے جارحانہ انداز سے وہ جھلا گیا تھا۔ آہستہ آہستہ اس کے دل پر لڑکپن کی اداسی اتر آئی اور وہ گرد و باتیں کرتے ہوئے اور باتیں سنتے ہوئے تمام آدمیوں کو وہ خاموش رقابت کے احساس کے ساتھ دیکھنے لگا۔ دائیں طرف نواب صاحب ان کی ساتھی ادھیڑ عمر خوبصورت عورت، دو انگریز اور ایک ہندوستانی چھوٹے سے دائرے میں بیٹھے تھے۔ ہندوستانی مسلسل باتیں کر رہا تھا اور اس کے ساتھی دلچسپی سے سن رہے تھے۔ جب وہ آیا تو تھوڑا گر کر چل رہا تھا اور سب لوگ بڑے تپاک سے اسے ملے تھے۔ چیف کمشنر اور مہاراج کمار کے بعد اس کی کار سب [illegible] سے اونچی اور چمکدار تھی اور اس کے پہیوں کے تار بجلی کی روشنی میں چمک رہے تھے۔ اس وقت اس کی ٹانگ' جو خراب تھی' بالکل سیدھی' اکڑی ہوئی کرسی پر سے نیچے سبزے تک آ رہی تھی لیکن اس کی باتوں کے بلے میں کوئی اس کی ٹانگ سے دلچسپی نہ لے رہا تھا۔ اس کے چہرے سے ذہانت ٹپکتی تھی۔ نواب صاحب کے خاص ملازم نے ایک رائفل اور ایک بڑی سی پستول جس کے پیچھے لکڑی کا دستہ لگا تھا لا کر اسے پکڑائی اور وہ تعریفی نظروں سے دیکھتا ہوا کچھ کہنے لگا۔

نعیم نے جب دوبارہ اینی بیسنٹ کی طرف دیکھا تو وہ کہہ رہی تھیں: ''میں بھی [illegible] گوکھلے سے ملنا چاہتی ہوں۔ بہت کمزور دکھائی دے رہے ہیں۔'' پھر وہ ایاز بیگ اور سیاہ بالوں والا شخص اٹھ کر ان [illegible] کرنے لگے۔ نعیم بھی ان کے پیچھے [illegible] جب [illegible] قریب [illegible] رہا تھا:

''[illegible] یہ جرمن کمبخت ایسی مشین بناتے ہیں! اب دیکھئے اس ساری پستول میں آپ کو ایک بھی کیل (rivet) نظر نہ آئے گی۔ سارا ویلڈنگ کا کام ہے۔ یہ اصل مرد کا کھیل ہے۔ پار سال شیر کے شکار کو چیف کمشنر کے ساتھ جو میں بنگال گیا......''

UrduPhoto.com

نعیم گزر گیا۔ باتوں کا شور عروج پر تھا۔ جب وہ دوسری طرف پہنچا تو اس کے ساتھی جھک جھک کر گوکھلے سے مل چکے تھے اور خیریت پوچھ رہے تھے۔ وہ صوفے کے پیچھے جا کر اندھیرے میں کھڑا ہو گیا۔ گوکھلے آنے والوں کو جگہ دینے کی خاطر کھسک کر صوفے کے کونے پر چلے گئے' جس سے ان کا چہرہ اچانک روشنی میں آ گیا۔

''ہم یہی بات کر رہے تھے۔ میں ان سے کہہ رہی تھی کہ مسٹر گوکھلے کی ''مجلس خدام ہند'' (Servants of India Society) خالص تھیوسوفیکل اصولوں پر بنائی گئی ہے۔'' اینی بیسنٹ نے کہا۔

''لیکن انہیں صرف لفظ 'ہند' پر اعتراض ہے۔ یعنی 'خدام انسانیت' کیوں نہیں؟'' ایاز بیگ بولے۔ ''یا خدام۔ تھیوسوفی!'' سیاہ بالوں والے شخص نے مسکرا کر کہا۔ اس کی بات کی ان سنی کر کے اینی بیسنٹ پھر بولیں:

''اس سے آپ مانیں گے کہ تحریک محدود ہو جاتی ہے۔''

گوکھلے سنبھل کر بیٹھے اور اپنے بوڑھے ہاتھوں میں چھڑی کو پھرانے لگے۔ ''تھیوسوفی......'' انہوں نے دھیمے لہجے میں بات شروع کی۔ پھر چشمہ اتار کر صاف کیا اور دوبارہ لگا لیا۔ ''تھیوسوفی' مسز بیسنٹ' نہ سائنس ہے نہ

سیاست۔ محض فلسفہ ہے۔ سیاست چند مادی فوائد کا نام ہے' جیسے بہتر خوراک' بہتر لباس' بہتر رہائش' انہیں حاصل کرنے کا طریقہ اور تھیوسوفی یا کسی بھی غیر مادی یا غیر عملی فلسفے پر یقین کر کے ہم یہ چیزیں حاصل نہیں کر سکتے۔ مادے کا ایک حجم ہوتا ہے اور وہ ایک خاص جگہ گھیرتا ہے۔ وہی مادہ اس سے زیادہ رقبے کی جگہ نہیں گھیر سکتا' چنانچہ محدود ہے۔ ہم مادے یا سیاست کو غیر محدود نہیں کر سکتے۔ 'خدام ہند' کے اصول اور طریقہ کار گو خالصتاً مادی تو نہیں اور انہیں کسی حد تک روحانی کہا جا سکتا ہے' کیونکہ جو لوگ مجلس میں شامل ہیں انہیں اپنے ہر آرام و آسائش کو ترک کر دینا پڑتا ہے' لیکن وہ کام کرتے ہیں دوسرے لوگوں کی بہتری کی خاطر' اور یہ دوسرے لوگ ہیں ہندوستان کے لوگ۔ یہی 'ہندوستان' کا لفظ مجلس کو ایک مادی شکل دے دیتا ہے۔'' ایلی بیسنٹ کسمسائیں' مگر جب بولیں تو ان کی آواز کم دل کش نہ تھی: ''لیکن میں نہیں سمجھتی کہ آپ وسیع تر مقصد اور اصطلاحوں سے کیوں گھبراتے ہیں۔ کام جو بھی ہو' ایک بڑا نام کام اور مقصد کو وسعت بخشتا ہے۔''

''لیکن یہ عظمت اور وسعت تو آپ سمجھتی ہیں یا نواب صاحب سمجھتے ہیں یا کرنل او کاٹ سمجھ سکتے ہیں۔ میرے ملک کے یہ چھوٹے چھوٹے لوگ نہ ذہین ہیں نہ روحانی بزرگ۔ ان سے اگر کہا جائے کہ دنیا کی بہتری کے لیے آؤ تو وہ اپنا کام ہوتا جاری رکھیں گے۔ لیکن اگر کہا جائے کہ ہند کے لیے' اپنے فلاں بھائی فلاں بہن کے لئے آؤ..... تو دیکھیے مسز بیسنٹ'' گوکھلے نے ایک ہاتھ سے چشمہ اتارا اور دوسرے ہاتھ کی انگلی ہلاتے ہوئے بولے۔ ''یہ لوگ جو کہیں [illegible] ضرور ہیں۔ وہ اپنے گاؤں' اپنی زمینوں' اپنے ماں باپ اور بچوں کے نام پر ضرور آئیں گے اور اسی لیے کسی سیاسی تحریک کو غیر محدود نہیں کیا جا سکتا۔''

اس لمحے نواب صاحب جو قریب سے گزر رہے تھے' چونک کر رکے۔ ''خوب۔ ہر طرف سیاسی تحریکات کی بات ہو رہی ہے۔ آپ بڑے کمزور نظر آ رہے ہیں۔ مسٹر گوکھلے آپ کی ذیابیطس کیسی ہے؟''

''خراب ہی جا رہی ہے۔ صحت یا موت کا غم تو نہیں' غم ہے تو محبت کا۔''

''محبت کا؟'' سیاہ بالوں والا آدمی مسکرایا۔ ایلی بیسنٹ خوبصورتی سے چونکیں۔

''جب سے پیدا ہوا میٹھے سے محبت کرتا رہا۔ اب ادھر دس برس سے میٹھا حلق سے نہیں اترا۔'' وہ ہنسے۔

''مگر پچھلی کرسمس پر جب بانکی پور آپ آئے تو آپ صحت میں تھے۔''

''آپ کانگرس کے اجلاس پر بانکی پور میں تھے؟'' ایلی بیسنٹ نے بات کاٹ کر کہا۔

''ہاں ہاں۔ میں تھا' گوکھلے تھے' مہاراج کمار تھے' مسٹر سنہا تھے۔'' نواب صاحب نے لنگڑے یا قوتی کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

''اوہ..... میں اس وقت ہندوستان میں نہیں تھی۔ اجلاس کیسا رہا؟''

''اچھا خاصا رہا۔ بہت لوگ آئے۔''

"بنگال کی تقسیم کے متعلق کوئی ریزولیوشن ہوا؟"

"اور......" نواب صاحب نے دماغ پر زور ڈالتے ہوئے سامنے دیکھا جہاں نعیم کھڑا تھا۔ وہ کھسک کر اندھیرے میں ہو گیا۔ "اور...... کیوں مسٹر گوکھلے؟"

گوکھلے نے: "بنگال تقسیم ہو یا متحد رہے آپ کا رائل بنگال ٹائیگر کا شکار جاری رہے گا۔"

"میری یادداشت کچھ ٹھیک نہیں رہی کئی دنوں سے۔" وہ کھسیانے ہو کر بولے اور اجازت لے کر چلے گئے۔

"آپ کا بانکی پور کے بارے میں کیا خیال ہے؟" ایجی ٹینٹ نے گوکھلے سے پوچھا۔

"خیال؟" وہ طنز سے مسکرائے۔ "بس ایسی ہی ایک پارٹی تھی جیسی آج ہے۔ بڑے شاندار لوگ تھے۔ خوبصورت اور اپ ٹو ڈیٹ، خوبصورت باتیں تھیں، خوش گپیاں تھیں۔"

"یہ تو زیادتی ہے۔ مسٹر گوکھلے میں بھی پریس کی طرف سے وہیں تھا۔ اچھی خاصی کانفرنس تھی۔" سیاہ بالوں والا آدمی شستہ انگریزی میں بولا۔

[illegible] ہاتھوں میں مروڑنے لگا۔ گوکھلے [illegible] سنجیدہ ہو گئے: "آپ کے [illegible] بھی تھا؟"

"[illegible] ضرور تھا۔" اخبار نویس نے رک کر بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ "آپ جنوبی افریقہ سے آ رہے ہیں [illegible] لکھے لوگوں کے [illegible] ہاتھ میں ہے۔"

"پڑھے لکھے لوگوں سے آپ کی مراد؟"

"یعنی کہ...... تعلیم یافتہ ہیں۔ تاریخ سے واقف ہیں اور......"

وہ نعیم آگے بڑھا جس سے اس کا چہرہ جو سرخ ہو رہا تھا روشنی میں آ گیا۔ ذرا سا جھک کر نوعمری کے جوشیلے لہجے میں وہ بولا: اور یہ بھی کہ ساری کارروائی انگریزی زبان میں ہوئی۔"

سب نے ایک ساتھ مڑ کر دیکھا۔ نعیم کے ماتھے پر پسینہ تھا۔ اس نے ٹوپی کے پھندنے کو اس زور سے کھینچا کہ وہ اس کے ہاتھ میں آ گیا۔ ایاز بیگ کا رنگ سفید پڑ گیا۔

"یہ کوئی بری بات نہیں۔ اس کے علاوہ کوئی بھی بڑی زبان سیکھنا معیوب نہیں بلکہ اچھی تعلیم ہے۔" اخبار نویس اپنے آپ کو سنبھال کر بولا۔

"اسی لیے کم پڑھے لکھے لوگ قید کر دیے جاتے ہیں۔ اور آپ کیا توقع رکھتے ہیں۔ تلک جیل میں ہے۔ کیا؟" اخبار نویس انگریز کا چہرہ ایک دم غصے سے سرخ ہو گیا۔ اس کے ماتھے سے نفرت ٹپکنے لگی اور وہ بار بار مٹھیوں کو کھولنے اور بند کرنے لگا۔ "تو آپ اسے سیاست دان کہتے ہیں وہ......" پھر اس نے ایک شریف انگریز کی تربیت کے مطابق انتہائی کوشش سے اپنے آپ کو قابو میں کیا اور خشک لہجے میں بولا: "اس کی سیاست کے متعلق تو جیف

کمشنر آپ کو بہتر بتا سکتے ہیں۔ ایک اخبار نویس کی حیثیت سے میں کہتا ہوں کہ وہ اچھا اخبار نویس بھی نہیں۔"
ایاز بیگ اعصابی حالت میں دونوں پاؤں ہلا رہے تھے۔ انار کے پتوں میں چھپا ہوا قمقمہ ہوا کے جھونکے کے ساتھ زور سے جھولا اور سایہ ان کے پاؤں پر ڈولنے لگا۔ اسی وقت سب لوگ کھانے کے لیے اٹھنا شروع ہوئے۔ گوکھلے اپنی بیسنٹ سے کہہ رہے تھے:

"لیکن چند نوجوانوں سے میں ضرور متاثر ہوا۔ موتی لال نہرو کا لڑکا بھی آیا تھا۔ ابھی کیمبرج سے لوٹا ہے۔"

اخبار نویس انگریز دیر تک کھڑا چہرے سے ہر تاثر کو دور کرنے کے لیے ماتھے پر رومال پھیرتا ہوا لنگڑا آدمی بڑی تندی سے باتیں کرتا اور ہنستا ہوا قریب سے گزرا۔ نعیم نے دیر تک جیبوں میں رومال تلاش کرنے کے بعد ٹوپی کے ساتھ ماتھے کا پسینہ پونچھا اور ہجوم میں شامل ہو گیا۔

کھانے کی میزوں کی دو لمبی قطاریں لگی تھیں جن پر سب مہمان بآسانی بیٹھ گئے۔ سبزے کے اس قطعے پر رنگین قمقموں کا جال بچھا تھا۔ رکابیوں میں بھنے ہوئے سالم مرغ اور بیر کی سرخ ٹانگوں پر کھڑے تھے۔ پلاؤ ابھی نہیں آیا تھا پر خوشبو آرہی تھی۔ بیس سے زیادہ قسم کے کھانے میز پر آچکے تھے۔ کھانوں کے درمیان چینی کی چھوٹی بے داغ پلیٹوں میں سیاہ چربی کی بھدی موم بتیاں کھڑی تھیں۔ یہ موم بتیاں درمیانی انگلی کے برابر موٹی اور خاصی بدشکل تھیں اور انہیں روشن نہیں کیا گیا تھا۔

ایک [illegible] سرے پر بچھی ہوئی کرسیوں پر نواب صاحب اور ایک [illegible] بزرگ آکر بیٹھ گئے۔ نواب صاحب نے شام کے کھانے کا لباس اتار کر اب سرخ چمکیلے ریشم کا لباس پہن رکھا تھا۔ یہ کچھ اس طرح کا لباس تھا جیسا مغل شہنشاہ یا ان کے درباری پہنا کرتے تھے اور آج کل سرکس کے مسخرے پہنتے ہیں۔ کپڑا ایسا تھا جو عورتوں کے لیے مخصوص ہوتا ہے۔ ایک لمبا سا تنگ بلاؤز تھا جس پر گلے تک سفید چمک دار بٹن لگے تھے۔ آستین چست تھی۔ کمر سے نیچے بلاؤز کا گھیر بڑا تھا اور نیچے اسی کپڑے کی بھاری سی تنگ پائنچوں والی شلوار تھی۔ جوتا بھی اسی کپڑے کا اور موزہ نما تھا۔ کمر کے ساتھ سنہری میان والی تلوار لٹک رہی تھی اور بلاؤز کی پٹی بھی سنہری تھی۔ ان کے ملازم خاص نے ایک بڑی سی سرخ ٹوپی جس پر سنہرا کام کیا ہوا تھا' لا کر ان کے سامنے میز پر رکھ دی۔ قریب ہی ایک پلیٹ میں کالی چربی کی سب سے بڑی موم بتی رکھی تھی۔ ساتھ والے بزرگ نے عام ہندوستانی مسلمانوں کا لباس' شیروانی اور پاجامہ پہن رکھا تھا۔ ان کے ساتھ دونوں طرف پرویز اور عذرا بیٹھے تھے۔ آگے وہ ادھیڑ عمر عورت تھی جو اب تیز روشنی میں خاصی معمر دکھائی دے رہی تھی۔ آگے چیف کمشنر' مہاراج کمار' اینی بیسنٹ' گوکھلے اور تقریباً سب انگریز مہمان تھے۔ میز کے آخر میں چند ہندوستانی تھے جن میں نعیم بھی بیٹھ گیا۔

دوسری میز پر بھی ہندوستانی تھے جن میں ایاز بیگ بھی تھے۔ ملازمین بے داغ لباس پہنے سرگرمی سے آجا رہے تھے۔ سارے غیر ملکی نواب صاحب کا عجیب و غریب لباس دیکھ کر چہروں پر سنجیدگی طاری کیے ہوئے تھے۔

جب سب لوگ بیٹھ چکے تو میز کے سرے والے بزرگ اپنی جگہ سے اٹھے۔ سب خاموش ہو گئے۔ ہوا

درختوں میں تھم گئی۔ چند لمحے تک خاموش کھڑے رہنے کے بعد انھوں نے رومال نکال کر ماتھے کا پسینہ خشک کیا اور بولے: ''آج یعنی 13 مئی 1913ء کو روشن آغا کو فوت ہوئے تین ماہ مکمل ہوئے ہیں۔ میں خاندانی روایات کے مطابق اور اس حیثیت کی رو سے جو مجھے سونپی گئی ہے 'نواب غلام محی الدین خان آف روشن پور کے روشن آغا کے لقب کا صحیح حقدار ہونے کا اعلان کرتا ہوں۔''

تقریر ختم کر کے انھوں نے جلدی سے سرخ ٹوپی اٹھا کر نواب صاحب کے سر پر رکھ دی' جس نے آنکھوں تک ان کا چہرہ چھپا لیا۔ پرویز اور عذرا اٹھ کر اپنے باپ کی طرف بڑھے۔ لیکن اس سے پہلے دوسرے بزرگ نے جلتی ہوئی تیلی ان کی طرف بڑھائی جس کی مدد سے انھوں نے اپنے آگے کی سیاہ موم بتی روشن کی۔ ''روشن آغا'' کہہ کر ان کے دونوں بچے ان سے لپٹ گئے۔

تالیوں اور مبارک بادوں کا شور برپا ہو گیا۔ غیر ملکی جو اب تک ضبط کے بیٹھے تھے' روشن آغا کی جیت کدائی پر اب دل کھول کر ہنس رہے تھے۔ روشن آغا اپنے دونوں بچوں کو تھامے جھک جھک کر مبارک باد وصول کر رہے تھے۔ ایک دفعہ جھکتے ہوئے ان کی عجیب و غریب ٹوپی ٹھوڑی تک لٹک آئی۔ عذرا نے جلدی سے اسے پھر سے ان کی آنکھوں پر اٹھایا اور احتیاط سے جھکنے کی تنبیہ کی۔ ہر طرف قہقہوں' تالیوں اور ''روشن آغا'' ''روشن آغا'' کی چیخوں کا شور تھا۔ خوب بیرے ہاتھ پیچھے باندھے شرما کر ہنس رہے تھے۔ قہقہے ایک ایک کر کے بجھنے شروع ہوئے حتیٰ کہ صرف رو[illegible] پرویز اور عذرا نے اپنے اپنے آگے کی موم بتیاں لے جا کر اس سے جلائیں اور واپس لا کر رکھ دیں۔ پھر معمر خوبصورت عورت اور دوسرے بزرگ نے ایسا ہی کیا۔ اس کے بعد چیف کمشنر اور مہاراج کمار اپنی اپنی موم بتیاں اٹھا کر لے گئے اور بڑی موم بتی سے روشن کر کے واپس لے گئے۔ پھر لیڈی جیسنٹ اور گوکھلے اٹھے' پھر اخبار نویس' پھر سب لوگ اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑی موم بتی کے گرد دھاندلی پڑ گئی۔ بعض لوگ موم بتیاں جلانے گئے اور وہیں کھڑے ہو کر گپیں ہانکنے لگے۔ اخبار نویس ایک بڈھے انگریز کو' جس نے اس سے شکایت کی تھی کہ ساری کارروائی کو پہلے سے چھاپ کر سب مہمانوں میں بانٹ دیا جاتا تو وہ اس گڑبڑ سے بچ جاتے' سمجھا رہا تھا کہ یہ ساری تقریب ایک خاندانی راز ہے اور اسے پرنٹ میں لانے کی ہرگز اجازت نہیں دی جاتی۔ بڑھتا سنجیدگی اور اداسی سے موم بتی کو تکے جا رہا تھا۔ ہر طرف سے قہقہوں کی آوازیں آ رہی تھیں۔

پھر موم شمعوں کی روشنی میں کھانا شروع ہوا اور خاموشی سے جاری رہا۔ اب چاند وسط میں آسمان پر روشن اور گرم تھا اور ہوا درختوں میں تھم چکی تھی۔ مدھم چاندنی میں دلی کی آدھی سے زیادہ آبادی سو چکی تھی اور روشن محل کے باغ میں مقدس چربی کی روشنی میں خاموشی سے کھانا کھایا جا رہا تھا۔ سفیدے کے اونچے درخت ساکت کھڑے تھے۔ میزوں سے پرے ایک فوارہ اندھیرے میں خاموشی سے پانی اچھال رہا تھا۔ نعیم نے کھانے پر سے سر اٹھا کر دیکھا۔ ساری فضا طلسمی سی تھی۔ ایک سحر۔ جس میں صرف خوشبودار کھانا اور جبڑے ہلاتے ہوئے لوگ حقیقی

تھے۔ ساری دنیا' سارے لوگوں کا صرف ایک کام تھا' کھانا۔ لنگڑے باتونی کی مہذب' خوش گوار آواز اب بھی آرہی تھی۔

''بھوک..... چونکہ انتہائی وحشت ناک انسانی جذبہ ہے' چنانچہ کھانا انسان کا شریف ترین فعل ہے۔'' وہ کہہ رہا تھا۔ نعیم کے دائیں بازو پر جو شخص بیٹھا تھا پلیٹ میں چاول نکالتے ہوئے اس کی طرف جھکا۔ ''میں نے آپ کو بات کرتے سنا جب آپ تلک کے متعلق کچھ کہہ رہے تھے۔''

اس نے دیکھا یہ وہی قد آور انگریز تھا جو کچھ دیر پہلے اپنے ساتھیوں کے سامنے جنگلی جانور کی طرح چلا رہا تھا۔ وہ پھر بولا: ''کیا آپ کو پتہ ہے کہ تلک نے مسلمانوں کے خلاف کیا کچھ کیا؟ وہ ذبیحہ گاؤ کے خلاف سوسائٹی اور مسجد کے سامنے باجا بجانے پر اصرار..... اور وہ سب۔''

کوئی جواب نہ پا کر کچھ دیر بعد اس نے دوبارہ گفتگو کی سعی کی: ''اس موم بتی کو دیکھ رہے ہیں۔ سنا ہے یہ چربی پچھلے سو سال سے اس خاندان کے پاس ہے۔ میں سوچتا ہوں جب یہ موم بتی بجھ جائے گی پھر کیا ہوگا؟''

نعیم نے مشکوک ہو کر اسے دیکھا۔ ''آپ کو کیسے پتہ چلا میں مسلمان ہوں؟'' اس نے آہستہ سے کہا۔

''اوہ..... '' جنگلی جانور برا سا منہ بنا کر بولا۔ ''آپ آج شام سرخ ٹوپی پہنے ہوئے تھے۔'' اس کے بعد اس نے کوئی بات نہیں کی۔

کھانا کافی دیر تک جاری رہا۔ پھر لوگ اٹھ اٹھ کر باہر جانے لگے۔ دوسرے ہال میں جب وہ آرام سے ٹانگیں پھیلا کر بیٹھ گئے تو بیرے کافی کے خوبصورت پیالوں میں قہوہ پیش کرنے لگے۔ جب کھانے کی میزوں پر وہ اکیلے رہ گئے تو روشن آغا اٹھے۔ دیر تک وہیں کھڑے وہ بڑی موم بتی کو ٹکٹکی باندھے دیکھتے رہے۔ اپنے انوکھے لباس میں وہ بیک وقت پارعب اور مسخرے دکھائی دے رہے تھے۔ پھر انہوں نے پھونک مار کر موم بتی کو بجھا دیا۔

''روشن آغا!'' ان کے ملازم خاص نے دھیرے سے کہا اور سارے دانت نکال کر ہنسنے لگا۔ انہوں نے ایک لحظہ غور سے اسے دیکھا' پھر اپنی چھوٹی انگلی سے چمک دار انگوٹھی نکال کر اس کی طرف اُچھالی جسے زمین پر گرنے سے بچانے کے لئے وہ دیوانہ وار ہوا میں ہاتھ چلانے لگا۔

جب وہ بجری کی سڑک پار کر کے دوسری طرف جا رہے تھے تو کونے والے درخت کے نیچے انہوں نے نعیم اور عذرا کو دیکھا اور ان کے مسرور چہرے پر فکر کی ایک پرچھائیں گزر گئی۔

نعیم قہوے کا پیالہ پکڑے پکڑے ایک عجیب و غریب درخت کے پاس جا نکلا۔ وہ گھنا سا پھیلا ہوا درخت تھا اور اس کی موٹی موٹی شاخیں نعیم کی چھاتی کے برابر آتی تھیں۔ اس کا جی چاہا کہ چھلانگ لگا کر اوپر چڑھ جائے۔ قہوے کا پیالہ شاخ پر رکھ کر اس نے اوپر دیکھا۔ شاخوں میں سرخ رنگ کا قمقمہ جل رہا تھا۔

''آپ اکیلے اکیلے کیوں پھر رہے ہیں؟'' عذرا نے قریب آ کر پوچھا۔ جواب دینے کی بجائے اس نے قہوے کا پیالہ اٹھایا اور گڑبڑا کر ایک جلتا جلتا گھونٹ بھرا۔

UrduPhoto.com